یادیں میرے یارِ طرحدار کی

عدیل صدیقی

2- Flamstead Avenue, London HAQ 6DL, United Kingdom

ہم بھی ملحد تھے ہمارا کیش تھا ترکِ رسوم
اپنی خوش بختی کہ آخر میں مسلماں ہوگئے

غالبؔ اور مومنؔ کے مصرعوں میں تحریف کرکے اوپر لکھا ہوا شعر اپنے دیرینہ مخلص دوست ساقیؔ فاروقی کی نذر کررہا ہوں۔ میرا اور ساقیؔ کا لندن میں چالیس سال سے زیادہ کا ساتھ رہا۔ قبل اس کے کہ میری یادداشت کم ہوجائے جو بڑھتی عمر کا تقاضا ہے، میں نے سوچا کہ اپنے یارِ طرحدار کے بارے میں وہ سب لکھ دوں جو میرے ذہن میں ہے اور بآسانی یاد آتا جارہا ہے۔ ذہن پر مزید بار ڈالنا ویسے بھی فائدہ مند نہیں:

پھڑ پھڑانے سے قفس ٹوٹتا جاتا ہے تو کیا
گھٹتی جاتی ہے جو طاقت پر پرواز میں ہے

میرے احباب میں یشبؔ تمنا، الیاسؔ ملک اور ارشد لطیفؔ صاحبان خاص طور پر مصر رہے کہ میں اب مزید تاخیر نہ کروں۔ صدیقہ بھابی (بیگم حبیب حیدرآبادی مرحوم) اور برادرم رفعت شمیم سے جب میں نے اس بارے میں رجوع کیا تو دونوں نے حوصلہ افزائی کی اور میں ان سب کا تہ دل سے مشکور ہوں۔ یہ سب مشورے اپنی جگہ جن پر میں غور کررہا تھا کہ کچھ دن قبل ساقیؔ میرے خواب میں آہی گئے۔ کچھ دنوں سے ان کی غزلوں کا مندرجہ ذیل مقطع میرے لبوں پر تھا:

ساقیؔ یادوں کی فصدوں سے جیتا جیتا خون بہے
میں رنگوں کی فصلیں کاٹ کے آج اپنے گھر لایا ہوں

کیا دیکھتا ہوں اس بڑے کمرے میں (جوان کی اسٹڈی اور ڈرائنگ روم تھا اور جہاں بیٹھ کر وہ اپنے لان کو دیکھا کرتے) یہاں بعد میں ان کا بستر لگا دیا گیا تھا۔ اب وہاں پہلے کی طرح کتابوں کا ڈھیر ہے اور وہ خود صاف ستھرے پینٹ شرٹ میں ملبوس کسی کو ٹیلی فون ملانے میں مصروف ہیں۔ ان کا نیا مجموعۂ کلام بادامی رنگ کے کاغذ میں پیک (Pack) کیا ہوا کمرے میں دوسری طرف رکھا ہوا ہے۔ میں اس کی طرف زیادہ توجہ دیے بغیر (اس خیال سے کہ ایک نسخہ تو ساقیؔ مجھے خود ہی دے گا) کوئی کتاب ڈھونڈ رہا ہوں۔ مجھے دیکھا تو کہا ''ذرا توقف کرو میں تمھیں اپنا نیا مجموعہ دوں گا!'' پھر کہنے لگا ''ابے تم کیا کررہے ہو؟'' میں نے کہا ''کچھ ڈھونڈ رہا ہوں بعد میں تمھیں بتاؤں گا۔'' بس اتنی بات پر:

خواب تھا ختم ہوا
ختم ہونے پہ مجھے خواب کا احساس ہوا (عدیلؔ)

ساقیؔ کی شاعری ن م راشد اور فیض کے رہتے ہوئے اپنا منفرد مقام بنا چکی تھی جسے ان دونوں کے علاوہ باقیؔ، علی سردارؔ جعفریؔ، احمد ندیمؔ قاسمی، جمیل جالبیؔ، شمس الرحمٰن فاروقی، گوپی چند نارنگ، شہریارؔ، مغنی تبسمؔ، زہرہ آپا، وزیر آغا، عزیز حامد مدنی، سلیم احمد، اطہر نفیسؔ، محبوب خزاںؔ، رضی اختر شوقؔ، وقار لطیفؔ، اکبر حیدرآبادی، فہمیدہ ریاض، پروین شاکر، کشور ناہیدؔ، خورشیدؔ رضوی، سعادت سعید اور افتخار عارف جیسے ماہرین فن نہ صرف پسند کرتے تھے بلکہ ساقیؔ کو یہ سب جدید شاعری کا روشن ستون مانتے تھے۔

قارئین! میں آپ کو پہلے ساقیؔ کی زندگی سے متعلق چند واقعات سے روشناس کراؤں گا۔ پھر ان کی شاعری کے بارے میں لکھوں گا۔ کوئی یہ دس برس پہلے کا واقعہ ہے۔ موسم گرما کا ایک خوش گوار دن تھا۔ مصطفیٰ شہابؔ اپنی مرسڈیز میں مجھے ساقیؔ، یوسفی صاحب اور ادریس بھابی (مسز یوسفی) کے ساتھ صدیقہ بھابی کے گھر لے گئے جہاں دوپہر کے کھانے پر ہم سب مدعو تھے۔ رسمی خیر مقدم کے بعد جب ادریس بھابی صدیقہ بھابی کے ساتھ دوسرے کمرے میں چلی گئیں تو پھر میرا یار جان سخن ساقیؔ یوسفی صاحب کے سامنے کھلنا شروع ہوا۔ یوسفی صاحب بھی اس کو ہوا دیتے رہے۔ ان دنوں ساقیؔ سے شراب اور سگریٹ جدا نہیں ہوئے تھے اور وہ مجبوراً مصطفیٰ کی گاڑی (جو ایک طرح کی پناہ گاہ تھی) میں جاتے اور گھر واپس آجاتے کیوں کہ ساقی کے ان دشمنوں سے صدیقہ بھابی نے اپنے گھر کو محفوظ رکھا ہوا تھا۔ اسی طرح کی ایک محفل میں یوسفی صاحب سے میں نے پوچھا کہ آپ کے خیال میں یہ جو ساقیؔ نے اپنی کتاب میں فیضؔ صاحب کی سستی اور بھول کا ذکر کیا ہے جس سے راشد صاحب کو تکلیف

ہوئی تو کیا یہ مناسب تھا؟ یوسفی صاحب پہلے تو مسکراتے ہوئے خاموش رہے پھر میں نے سوال کو وضاحت کے ساتھ طوالت دی کہ ہمیں فنکار کے فن سے مطلب رکھنا چاہیے نہ کہ اس کی نجی زندگی اور کمزوریوں سے تو فرمایا: ''عدیل صاحب! اس میں کوئی قباحت نہیں کہ فنکار کی زندگی اور کردار کو سامنے رکھا جائے اور ان کا ذکر کیا جائے۔ اس طرح اس کے فن کو سمجھنے میں مدد ہی مل سکتی ہے۔'' میں نے عرض کیا کہ اگر میں ساقی کے بعد زندہ رہا تو کیا میں اس کی بھی نجی زندگی سے چند واقعات بیان کرنے کا مجاز ہوں گا؟ یوسفی صاحب نے فرمایا: ''کیوں نہیں بلکہ آپ کے لیے ایسا لکھنا ضروری ہے۔'' اتنے میں ساقی گھر میں داخل ہوئے۔ میں نے ساقی سے کہا: ''ابھی ہم یہ بات کر رہے تھے کہ یہ کیا ضرور تھا کہ تم فیض صاحب کی کاہلی اور بھول کو جو راشد صاحب سے متعلق تھی، اپنی کتاب میں بیان کرتے۔'' ساقی نے کہا: ''کیوں نہیں اس میں کوئی مضائقہ نہیں کہ اس طرح فنکار اور اس کے فن کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے اور اگر یہ نہ کیا جاتا تو میر، نظیر، ذوق، غالب، انشا اور ظفر کے بارے میں تشنگی رہ جاتی۔'' معزز قارئین! یہ تو اس مضمون کا ایک طرح جواز ہے کہ ساقی کے بارے میں لکھنا اس کی شاعری کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے اس کی کردار کشی کے لیے نہیں۔

ساقی سے میرا تعارف ڈاکٹر لطیفہ نے ستر کی دہائی میں کروایا۔ ہوا یوں کہ نفیس (میری اہلیہ) کے پھوپھا کے ایم اے منیر صاحب مرحوم جو ہیسنز گروپ کے مالکان میں سے تھے، سخن فہم اور ادب نواز تھے لطیفہ ان کے دوست شیخ محبوب عالم صاحب مرحوم سابق میئر لاہور کی صاحبزادی ہیں اور شاعری کا اچھا ذوق رکھتی ہیں۔ منیر انکل نے لطیفہ کے ذریعے اپنے لندن کے گھر میں مشاعرہ منعقد کیا۔ میں ان دنوں لندن میں نو وارد تھا اور شعرا میں سوائے اطہر راز اور وقار لطیف کے کسی سے واقف نہ تھا۔ ان دونوں کی مدد سے لطیفہ اور میں نے شعرا کا انتخاب کیا جن میں سرفہرست اکبر بھائی، (اکبر حیدر آبادی) اور ساقی تھے۔ مشروبات اور طعام کا انتظام نایاب عباسی مرحوم کے ذمّے تھا جو کندن ریسٹورنٹ کے منیجر تھے۔ لذیذ کھانے اور مشروبات کا اثر اتنا رہا کہ نہایت کامیاب مشاعرے کے بعد بعض شعرا بشمول عابد نامی رات میں انکل کا گھر چھوڑنے پر راضی نہ تھے۔ اطہر راز کو ٹیکسی ڈرائیور کی مدد سے بہ مشکل ٹیکسی میں بٹھا کر روانہ کرنا پڑا اور ٹیکسی کا کرایہ پیشگی انکل کو دینا پڑا۔ اس مشاعرے میں ساقی نے اپنے مخصوص ڈرامائی انداز میں کلام سنایا۔ بہ قول یوسفی صاحب ''چھ سات برس پہلے تک گلے میں رنگ برنگ موتیوں اور منکوں کی مالا پہن کر ساقی گھن گرج کے ساتھ شعر پڑھتے تو لوگ شاعری سے چکا چوند ہو کر موتی گننے لگتے۔ حسن شعر خوانی میں جب جلالی لہجے اور اعلیٰ درجے کی اسکاچ وہسکی کی ملاوٹ ہو جائے تو شعر سہ آتشہ ہو جاتا ہے۔ پڑھت اس قیامت کی کہ ایک ایک لفظ کو زندہ کر کے سامنے لا کھڑا کرتے ہیں۔ خرگوش، کبڑے یا مینڈک پر نظم پڑھتے تو بالکل وہی بننے کی بڑی کامیاب کوشش کرتے ہیں۔'' یوسفی صاحب نے یہ جانتے ہوئے کہ ایک نظم سور پر بھی ساقی نے کہی ہے اس کا تذکرہ نہیں کیا کہ ساقی کو سب کے سامنے ذلیل نہ ہونا پڑے! اس رات تمام شعرا اور سامعین جو شوق فرما رہے تھے، ساقی کے شور سے تھوڑی دیر کے لیے ہوش میں آ گئے اور ان کا نشہ ہرن ہو گیا۔ ساقی کے اس ایک کام نے باوجود اس کے کہ وہ خود اپنے کلام میں ڈوبے ہوئے تھے سب کو جگا دیا۔ اس مشاعرے کے بعد میری اور ساقی کی دوستی بڑھتی گئی۔ ہم مہینے میں ایک دو بار ملتے۔ پھر جب شاعری کی طرف میری طبیعت مائل ہوتی تو پہلے اکبر بھائی سے رجوع ہوتا اور پھر ساقی سے۔ اکبر بھائی ہر بار پوچھتے کہ ساقی کو کلام دکھایا اور جب میں نفی میں جواب دیتا تو کہتے کہ میں نے جو اصلاح کی ہے وہ ساقی کو دکھانا اور اگر وہ اس میں کوئی تبدیلی کرے تو مجھے بتانا۔ کئی دفعہ میرا کلام دونوں کا موضوع بحث رہتا اور میری معلومات میں اضافے کا سبب بنتا۔ ساقی ہندوستان یا پاکستان میں رہتے تو انعام و اکرام سے نوازے جاتے۔ بے چارے کو اس کا بڑا احساس رہا کہ دونوں جگہ سے انھیں کچھ نہ ملا۔ یہاں انھوں نے لوگوں کو چونکا کر اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے خدا کا انکاری یعنی ملحد ہونے کا چکر چلایا۔ مجھ سے اس بارے میں بحث کرتے، کتابیں ایکسچینج کرتے، لیکن اعلان یہ کر رکھا تھا کہ ''میں محمد ﷺ کا آدمی ہوں، مگر مذاہب کے بنائے ہوئے خدا کو نہیں مانتا جب تک کہ وہ مجھ میں اُتر کر نہ آئے اور مجھ سے خود نہ ملے!''

وہ خدا ہے تو مری روح میں اقرار کرے
کیوں پریشاں کرے دور کا رہنے والا

میں اس کو سمجھاتا کہ تم اس قابل نہیں ہو کہ خدا تم میں اُتر آئے۔ تم صبح سے وہسکی پیتے ہو اور تمہارے منھ سے شراب کی بو آتی ہے اور نہ ایسا کسی ذی نفس کے لیے ممکن ہے۔ ہم خدا کی ذات کے بارے میں بحث کرتے قرآن سے، جس کا وہ بڑا احترام کرتا، میں کئی آیات اور لیس کمثلہ شیئٌ کا حوالہ دیتا اور علامہ اقبال کی نظم 'لینن خدا کے حضور میں' سناتا۔ ضدی ساقی کہاں مانتا۔ اپنا پرچار کرنے کی غرض سے بی بی سی کے کرشن گولڈ کو جو انٹرویو دیا اس میں بھی خدا کے انکار کی بکواس کر ڈالی۔ اس وجہ سے لوگ اس سے خفا ہو گئے اور مشاعروں میں بلانا چھوڑ دیا۔ انگریزی میں بھی ایک

نظم لکھی جس میں حضرت عیسیٰ، حضرت مریمؑ اور اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ سے بے ادبی کی۔ نتیجتاً جہاں وہ نظم سنائی گوروں نے ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔

ساقیؔ کو اس کا بڑا احساس تھا کہ وہ جدید شاعری کا امام بلکہ خدا ہے اور مشفق خواجہ کو اس نے، مجھے یاد پڑتا ہے کہ لکھا بھی تھا، کہ تم سب یعنی مشفق سمیت ہم تمام اس کی خدائی کا اعلان کردیں۔ سچ تو یہ ہے کہ محمد ﷺ سے ساقیؔ کو محبت تھی جس کا اظہار وہ کرتے رہتے۔ سلمان رشدی نے Satanic Verses شائع کی تو اس کو ٹیلی فون پر گالیاں سنائیں۔ مجھے اس دن گھر بلایا۔ میں دوسرے دن گیا۔ مجھ سے کہا: ''میں نے سالے کو خوب نوازا۔ اب بتاؤ میں نے محمد ﷺ کے آدمی ہونے کا ثبوت دیا کہ نہیں؟!'' میں نے کہا: ''بس اب خدا کو مان لو تمہاری بخشش ہوجائے گی۔'' مسکرا کر چپ ہوگئے۔ شاید ابھی ایمان کے اظہار کا وقت نہیں آیا تھا۔

ساقیؔ اعلیٰ درجے کے جدید شاعر ہونے کے علاوہ سخن فہمی میں کمال رکھتے تھے جس کا ایک ثبوت ان کے وسیع مطالعے سے ملتا ہے۔ انھیں قدیم شعرا یعنی کلاسیکل اساتذہ کے بیسیوں شعر ازبر تھے جو ہمیں سناتے رہتے۔ یاد آیا کہ مجھے ایک شعر سمجھنے میں کچھ اشکال تھا جب میں نے انھیں سنایا تو سوچتے رہے اور پہلے تو زبانی طور پر سمجھایا پھر بھی فہم مطلب میں مشکل ہو رہی تھی تو کہا کہ لکھ دو۔ میں نے تعمیل کی۔ دوسرے دن ہم کہیں ملنے والے تھے شعر کی تشریح لکھ کر دے دی۔ وہ داغؔ کا شعر تھا:

ہم ایسے محوِ نظارہ نہ تھے کہ ہوش آتا
مگر تمہارے تغافل نے ہوشیار کیا

ساقیؔ نے نثر میں بھی اپنا مقام بنا لیا تھا۔ وہ خطوط جو انھوں نے ن۔م راشدؔ، شمس الحسن فاروقیؔ، احمد ندیم قاسمی، مشفق خواجہ اور وزیر آغا کو لکھے ہیں ان کی ادبی علمیت، تنقید اور زبان پر قدرت کے شاہد ہیں۔ وزیر آغا کے ساتھ تو اظہار میں ادب کے ساتھ ساتھ بے ادبی کر گئے۔ ہدایت نامہ شاعر، اور 'بازگشت و بازیافت' ان کے ادبی شاہکار ہیں۔ ساقیؔ کی نثر نگاری کی یوسفی صاحب اور زہرہ آپا نے مجھ سے شخصی طور پر تعریف کی ہے۔ میرے خیال میں شعرا میں غالبؔ اور فیضؔ صاحب کے بعد اتنی عمدہ نثر کم ہی لکھی گئی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کی تلون مزاجی جلالی رنگ میں جب بھی جلوہ گر ہوتی مخاطب کو تحریراً یا زبانی طور پر مجروح کرتی اور وہ اعتدال سے ہٹ جاتے۔ اس طرح کی زندہ مثالیں وزیر آغا اور مدیر سوغات محمود ایاز پر ان کے وار ہیں۔ دونوں نے اپنے رسالے میں ان پر خصوصی گوشے نکالنے پر کچھ وقت مانگا تھا اور ان کے حکم کی فوری تعمیل نہیں کی تھی۔ انھیں گالیوں سے نوازا۔ محمود ایاز تو بے چارے شریف آدمی تھے۔ اللہ نے انھیں مزید شر سے دور کر دیا اور اپنے پاس بلا لیا۔ البتہ وزیر آغا پر جو کچھ ساقیؔ نے لکھا وہ قابل اعتراض ہونے کے باوجود اردو ادب میں معلوماتی اضافہ ضرور کرتا ہے۔ سرگودھا کے رہنے والوں نے بھی خوب خوب جوابی وار کیے اور آغا صاحب کے انتقال پر یہ محاذ بند ہوا۔ ساقیؔ کی آخری کتاب ان کے مطابق ''سرخ گلاب اور بدر منیر'' ہے جو سنگ میل لاہور نے ۲۰۰۵ء میں شائع کی اور جو انھوں نے مجھے اور میری بیوی کے نام 'دلارا اور پیارا' کے ساتھ دی۔ مجھے ان کی تمام غزلیں پسند ہیں خاص کر وہ جن میں کلاسیکل رنگ کم نہیں ہوا اور یہ رنگ ہر غزل میں کم و بیش قائم رہا۔ نظم تو انھیں ہم عصروں میں ممتاز کرتی ہے۔ مشہور شاعر باقیؔ نے اپنی کتاب 'حساب رنگ' جو ساقیؔ کو دی اس پر یوں لکھا ''نئی شاعری کے سب سے زیادہ متحرک شاعر، جان سے زیادہ عزیز ساقیؔ فاروقی کی نذر ۱۹۷۵ء'' مجھے ساقیؔ کی جو نظمیں بے حد پسند ہیں وہ حسب ذیل ہیں ''سرخ گلاب اور بدرِ منیر، رنگ اور آگ، شکست کی آواز، انہدام، دنیا، زندہ پانی سچا، منتقم، باکرہ، دعا، خالی بورے میں زخمی بلّا، شاہ صاحب اینڈ سنز، ناسپاس لہر کی تلاش، مکڑا، بریسٹ کینسر، مستانہ ہجڑا اور حمل سرا۔

اپنے ہم عصر شعرا میں ساقیؔ ناصرؔ کاظمی، ن م راشدؔ، فیضؔ، مجید امجدؔ، عزیز حامد مدنیؔ، سلیم احمدؔ، مخدومؔ، اطہر نفیسؔ، احمد ندیم قاسمیؔ، باقیؔ، فراقؔ، شہریارؔ، شکیب جلالیؔ، محبوب خزاںؔ، پروین شاکرؔ، فہمیدہ ریاضؔ، کشور ناہیدؔ، افتخار عارفؔ اور احمد مشتاقؔ کے مداح تھے۔ میں ایک آدھ نام غالباً بھول رہا ہوں۔ اساتذہ میں میرؔ، سوداؔ، نظیر اکبر آبادی، میر حسنؔ، مصحفیؔ، ذوقؔ، میر دردؔ، آشفتہؔ، غالبؔ، داغؔ، حالیؔ، اقبالؔ، فراقؔ، یگانہؔ، فانیؔ، حسرت موہانیؔ کا احترام کرتے اور ان مرحومین کے بیشتر اشعار انھیں یاد تھے۔ علامہؒ کی نظم 'قرطبہ' کو وہ اردو زبان کی سب سے عمدہ نظم سمجھتے تھے اور علامہؒ کے خلاف کوئی بات سننا پسند نہیں کرتے۔ جدید شاعری میں وہ نظم کو مختصر رکھنے کے قائل تھے۔ اس پر مجھے ایک واقعہ یاد آرہا ہے جو قارئین کی دلچسپی کی خاطر لکھ رہا ہوں علامہؒ کی طویل نظموں پر تو وہ اعتراض سننے کو گوارا نہیں کرتے، لیکن ایک نجی محفل میں فیضؔ صاحب اپنی نظم جس کا مطلع ہے 'مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ' سناتے ہوئے جب آخری بند 'ان گنت صدیوں کے تاریک بہیمانہ طلسم' پر آئے تو ساقیؔ مخل ہوئے اور فیضؔ صاحب کو یہ کہہ کر روک دیا ''فیضؔ صاحب، بس آگے نہ جایئے، نظم ختم ہوچکی ہے، اب ظلم کی کہانی سوشلزم کے لبادے میں نہ دکھایئے!'' اس پر سب حاضر شعرا نے شور مچایا کہ یہ کیا بدتمیزی ہے؟ مگر فیضؔ صاحب مروت میں رُک گئے اور کہا ''بھئی ہم بھی ساقیؔ کا خیال کرتے ہیں اور اگر وہ اسے

زبردستی سمجھتا ہے تو ہم رُک جاتے ہیں۔ظلم نہیں کریں گے!''

ساقی ادب نواز اور یاروں کے یار تھے۔ جب کوئی تازہ نظم یا غزل ہوجاتی تو لندن میں پہلے یوسفی صاحب اور خالد حسن قادری مرحومین کو سناتے اوران سے داد پاتے۔ پھر اکبر حیدرآبادی مرحوم اور افتخار عارف اور صدیقہ بھابی کو سنانے کے بعد پاکستان میں زہرہ آپا، فیض صاحب، سلیم احمد، عزیز حامد مدنی، احمد ندیم قاسمی اور مشفق خواجہ کو سناتے۔ ہندوستان میں شمس الرحمٰن فاروقی اور شہریار مرحوم کو سنائے بغیر اور کسی کو نہ سناتے۔ یہ وہ عمل تھا جو بیشتر میرے اور جتندر بلّو کے سامنے ہوا ہم دونوں کی تو اس کے آغاز سے پہلے ہی طلبی ہوجاتی اور ہم تو التابعین الاولین میں سے تھے۔ہم کوئی دس بجے بلائے جاتے۔ پھر ہم سب یعنی الیاس ملک، ارشد لطیف، ڈاکٹر جاوید شیخ، جتندر بلّو، یشب تمنا، فیضان عارف اور مصطفیٰ شہاب (یہ تھا ہراول دستہ) پیدل چلتے ہوئے ایک قدیم قبرستان سے گزرتے اور ساقی کے منتخب کردہ آریش پب پہنچتے جہاں فش اور چپس کھائے جاتے۔ دونوں منزلیں یعنی قبرستان اور آریش پب ساقی کے پسندیدہ تھے۔قبرستان میں تو رُک رُک مدفون مردہ مرد و خواتین کو اساتذہ کے کلام سے نوازا جاتا اور پب میں جدید شاعری سنی اور سنائی جاتی۔ پھر یہ قافلہ ساقی کے گھر واپس آتا۔ جہاں کافی پی جاتی اور سب حاضرین (سوائے ڈاکٹر جاوید شیخ کے جو تا حال سخن فہم ہیں اور جتندر بلوّ کے جو افسانہ نگار ہیں) اپنی اپنی تازہ تخلیقات سناتے جن پر ساقی اپنی تجاویز دیتے۔ پچھلے چند برسوں سے دو تازہ واردانِ بساطِ غزل، میری مراد شہباز خواجہ اور سلیم فگار سے ہے، اس محفل میں شامل ہونے لگے تھے اور ساقی ان کے کلام سے کہ اس میں تازگی تھی، خوش تھے اور ان دونوں کی حوصلہ مندی کرتے۔ یہ سلسلہ چھ سات برس چلتا رہا اور ساقی کی بیماریوں پر ختم ہوگیا۔

خدا کے وجود کے بارے میں بقول ان کی بیگم کے، ساقی نے ایک ڈراما رچایا ہوا تھا اس کا انکشاف مرحومہ نے ساقی اور ارشد لطیف کے سامنے مجھ سے کیا، ساقی بہت سٹپٹائے۔ مرحوم اپنے مقامی اسلامک سینٹر میں جاتے رہتے، مگر ہم سب سے چھپائے رکھا تھا۔ سب دوستوں کے سامنے یہ بھی کہہ رکھا تھا کہ میری نمازِ جنازہ عدیل پڑھائے گا۔ میں ان سے کہتا کہ تم جب تک خدا پر ایمان نہیں لاؤ گے یہ ممکن نہ ہو پائے گا! مسکرا کر چپ ہوجاتے۔ ایک دن اپنی بیگم کے سامنے مجھ سے کہا:

"Make sure that I am buried in Islamic way and no cofusion is created in this respect as was done in the case Rashid (Noon Meem Rashid) who was cremated by his wife!!"

اس پر گُنڈی (ساقی کی بیگم گُنہلڈ جنھیں ساقی پیار سے گُنڈی کہتے تھے) نے برجستہ جواب دیا:

"It will be my decission and rest assured that I will go for cheapest option available!"

خدا کا شکر ہے ایسا نہ ہوسکا اور خاتون ساقی سے پہلے گزر گئیں۔ انتقال سے کوئی دو برس قبل میں، رفعت شمیم اور باسط کانپوری انھیں اسپتال میں ملنے گئے اور پھر جب دوسری بار ڈاکٹر ہلال فرید ہمارے ساتھ تھے تو کہنے لگے کہ اب میں خدا کو ۹۹ فیصد مانتا ہوں۔ صرف ایک فیصد شک رہ گیا ہے۔ میں نے کہا یہ ایک فیصد غنیمت ہے اگر یہ ختم ہوگیا تو مجھے ڈر ہے کہ تم نبوت کا دعویٰ نہ کرنے لگو۔ ہلال نے کہا ساقی صاحب آپ تو مجھ سے بہتر ہیں۔ میں تو ۵۱ فیصد خدا پر ایمان رکھتا ہوں۔ یہ سن کر خوش ہوگئے کہ وہ ایک شاعر سے اس باب میں آگے ہیں ویسے نظریاتی طور سے وہ یقیناً سوشلسٹ تھے اوران کی بیگم تو پکّی بائیں باز و والی تھیں۔ میں چاہتا تھا کہ ساقی کی شاعری پر تفصیل سے لکھوں، مگر اس احساس کے ساتھ کہ تنقید نگار حضرات نے بہت کچھ لکھا ہے اور آگے مجھ سے بہتر لکھنے والے موجود ہیں، میں نے قلم نہیں اُٹھایا۔ صرف اتنا عرض کرتا چلوں کہ ساقی کے سماجی شعور کے مظاہر بیشتر نظمیں ہیں، مگر انھوں نے اپنے اطراف سیاسی جبر و تشدد پر دیکھتے ہوئے کچھ نہیں لکھا۔ جیسے فیض صاحب نے فلسطین اور مشرقی پاکستان پر تو لکھا، مگر کشمیر پر ایک قطعہ بھی نہیں کہا۔ تاہم مجھے ساقی کی شروع شروع کی غزلیں جن میں روایتی رنگ ہے، پسند ہیں۔ ان میں بلا کی آمد ہے۔ زبان رچی ہوئی اور معنی آفرینی سے غزلیں غنائیت لیے ہوئے ہیں۔ طوالت کے خوف سے اپنے پسندیدہ اشعار بھی نہیں لکھ رہا ہوں البتہ ان تیس سے زائد اشعار میں جو الحاد اور خدا سے متعلق ہیں، میں نے چند منتخب کیے ہیں جو درج ذیل ہیں:

ہمیں تباہ کیا آب و گِل کی سازش نے
کہ ایک دوست ہمارا بھی آسمان میں ہے

افسوس کہ انکار کی منزل نہیں آئی
ہر چند کہ در بند نہیں کا نہیں رکھتے

عمر انکار کی دیوار سے سر پھوڑتی ہے
رنج یہ ہے اسے آیا نہ سلیقہ اپنا

ایک استثنا د....

تو ماہ پس ابر کی مانند ہے مجھ میں
مستور بھی رہ اور دکھائی بھی مجھے دے

ایک شکایت....

تمام عمر مجھے قید اشتباہ میں رکھ
نظر شناس مرا شوق بھی نگاہ میں رکھ
ایک دن رات کے اسرار کھلیں گے ہم پر
شک کی بوچھار سے چھلنی ہوا سینہ اپنا
ہماری شکستوں کا بن بھی تو ہے
خدا آدمی کی تھکن بھی تو ہے
وہ خدا ہے تو میری روح میں اقرار کرے
کیوں پریشان کرے دور کا رہنے والا
میں تو خدا کے ساتھ وفادار بھی رہا
یہ ذات کا طلسم مگر ٹوٹتا نہیں

خدا پر یقین آ رہا تھا....

انکار نہ کر چراغ ہو جا
اب روشنی اختیار کرلے
جس نے عرفان کی قندیل جلائی دل میں
شک نہ کرنے کا حوالہ اسی رب سے آئے
میرے اندر اسے کھونے کی تمنا کیوں ہے
جس کے ملنے سے میری ذات کو اظہار ملے
غرض کہ جوڑ لے رشتہ کسی حقیقت سے
تمام عمر فقط قیدیِ قیاس نہ رہ
یہ اور بات مجھے اعتراض کوئی نہ تھا
ملال تھا کہ خدا کا جواز کوئی نہ تھا
بہت دنوں سے ہمارے تعلقات نہیں
مگر خدا کی گلی سے گزر بھی جاتے ہیں
میری دلیل مان وہاں کوئی بھی نہیں
اور مجھ پہ اعتبار ہے تو مرکے دیکھ

مرنے سے بہت قبل مرحوم الحمدللہ ایمان لا چکے تھے۔ میں نے علامہ کی نظم 'لینن خدا کے حضور' میں سنائی جس کا دیر سے سہی اثر ہوا اور آخر میں یہ شعر دیکھئے اقرار کی طرف قدم بڑھ رہے تھے۔

میں آج بھی ہوں اسیرِ قیاس آرائی
ترا جمال گرفتِ نظر سے باہر ہے

اور بالآخر وہ شعر جو اوپر لکھ چکا ہوں، دہرا رہا ہوں:

انکار نہ کر چراغ ہوجا
اب روشنی اختیار کرلے

اور جب اس نے روشنی اختیار کر لی تو کیا ہوا؟

یہ کہہ کے ہمیں چھوڑ گئی روشنی اک رات
تم اپنے چراغوں کی حفاظت نہیں کرتے

چنانچہ انتقال سے تقریباً دو سال قبل ذہنی دباؤ میں آکر خودکشی کی ناکام کوشش کی۔ جب وہ کیفیت گزر گئی تو اسپتال میں میرے اور رفعت شمیم صاحب کے سامنے ہوش وحواس میں اللہ پر اپنے ایمان کی تصدیق کی اور مصر رہے کہ میں وعدہ کروں کہ ان کی نماز جنازہ پڑھاؤں۔ میں نے ہامی بھری کہ مطمئن رہیں۔ انھیں ڈر تھا کہ مسجد کا کوئی نو وارد امام لوگوں کی باتوں میں آکر کہ یہ ملحد ہے، نماز نہ پڑھائے۔ الحمدللہ ایسا کچھ نہیں ہوا اور مسجد والوں نے جوان کے صاحب ایمان ہونے سے واقف تھے، حسن و خوبی سے تکفین و تدفین کا انتظام کیا۔ گُنڈی کے انتقال کے بعد انھیں نرسنگ ہوم میں ان کی بیٹی اینگا نے منتقل کیا جو اینگا کی دوست کا تھا اور جہاں وہ خوش تھے۔ وہاں وہ چند ہفتے زندہ رہے۔ ان کی بیٹی کے علاوہ دوستوں میں الیاس ملک صاحب سب سے زیادہ ان کا خیال رکھتے تھے۔ اللہ انھیں اس کی جزا دے۔ ایک دوپہر جب میں اور جتندر بلّو صاحب انھیں دیکھنے گئے تو الیاس ملک اور راشد لطیف صاحبان کی موجودگی میں اعلان کیا کہ آج خدا کچھ دیر قبل ملنے آ گیا۔ یہ کہتے ہوئے ان پر ایسی سنجیدگی طاری تھی جو میں نے کبھی نہیں دیکھی۔ میں نے پوچھا کیا خواب میں؟ کہا نہیں ''یہیں اس بستر پر جب میں ہوش میں تھا، چلو اب میرا ایمان مکمل اور پختہ ہوگیا۔'' دو تین دن بعد الیاس ملک صاحب نے اطلاع دی کہ انھیں اسپتال منتقل کیا گیا تھا جہاں ضروری طبی امداد دی گئی اور کچھ دیر بعد ان کا انتقال ہوگیا:

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھے

آخر وقت تک ان کی یادداشت اور حسِ مزاح میں فرق نہیں آیا تھا۔ جیسا کہ کسی کالم نویس نے لکھا کہ ان کی میموری کم ہوگئی۔ حسب معمول گرم جوشی سے ملتے رہے اور ہر دوست کو اپنے دبے ہوئے القاب سے نوازتے رہے۔ اب نہ وہ میرا یار رہا نہ وہ صحبتِ یاراں۔

◆◆◆